

# ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے؟

تحریر: سید عبدالحکیم ایم اے (عثمانیہ) دو حہ قطر  
(قسط نمبر ۱)

قرآن حکیم کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کائنات میں ایک لامتناہی رحمت، رحمت و کرم کے ساتھ مصروف عمل ہے اور زندگی کے ہر قدم پر ہماری رہبری کرنے پر آمادہ ہے۔ اگر ہم اپنے رب کریم پر بھروسہ کریں اور اعتصام و توکل کے طریقوں سے واقف ہو کر اس کے دامن میں چنگل ماریں، تو ہمیں احساس ہوگا کہ ہمیں کائنات میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑا گیا ہے۔ ساری زندگی لطف حق شامل حال رہتا ہے۔ زندگی حق تعالیٰ کی نعمت و فضل سے مملو (بھر) جاتی ہے۔ اگر ہم رضائے حق کے تابع ہو جائیں اور حق تعالیٰ کو کافی سمجھ کر سارے کام ان کے سپرد کر دیں، تو اطمینان قلب و جمعیت خاطر نصیب ہوتی ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں سلامتی و نجات کی طرف لے جانا چاہتے ہیں ﴿والله يدعوا الى وادى السلام﴾ (سورۃ یونس: ۲۵) ترجمہ: ”اور اللہ تعالیٰ (لوگوں) کو سلامتی والے گھر کی طرف بلاتے ہیں (جو ہلاکت اور تباہی سے بچا ہوا ہے)۔“ ان تجربات میں کامیاب کرنا چاہتے ہیں جن سے ہم گزر رہے ہیں اور جن سے ہم خوفزدہ ہیں۔

﴿ان الله لذو فضل على الناس﴾ (البقرہ: ۲۴۳)

”وہ ہمارے ضعف و کمزوری سے واقف ہیں، وہ ہمارا بوجھ بھکا کرنا چاہتے ہیں۔“

﴿يريد الله ان يخفف عنكم وخلق الانسان ضعيفاً﴾ (نورۃ النساء: ۲۸۱)

ترجمہ: ”حق تعالیٰ ہمیں برترین مسرت عطا کرنا چاہتے ہیں اور اس سرور سے ہمارے قلوب کو مملو کرنا چاہتے ہیں جس کا خود ہمیں اندازہ نہیں۔“

﴿فلا تعلم نفس ما أخفى لهم من قرة أعين جزاء بما كانوا يعملون﴾ (السجدہ: ۱۷)

یعنی: ”آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان خزانہ غیب میں موجود ہے اس کی کمان کو خبر نہیں۔“

دنیا میں ہر جگہ ایک کامل الہی نظم موجود ہے جس میں توافقی و ہم آہنگی بھی ہے اور سرور و سکینہ بھی۔

حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی اس نظم الہی کے دائرہ میں بسر ہو۔

﴿هو الذي يصلي عليكم و ملائكته ليخرنك من الظلمات إلى النور وكان

بالمؤمنين رحيماً﴾ (الاحزاب: ۴۳) یعنی: ”حق تعالیٰ اور اس کے فرشتے، مومنوں پر رحمت بھیجتے ہیں۔“

حق تعالیٰ ان کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور وہ ایمانداروں پر بہت مہربان ہیں۔

اسی زندگی میں ہمیں یہ نعمت مل سکتی ہے اور حق تعالیٰ ہی ہمیں عطا کر سکتے ہیں۔

﴿وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ﴾ (النحل: ۵۳) اگر ہم حق تعالیٰ پر کامل بھروسہ کریں تو ہماری مثال اس درخت کی سی ہو جاتی ہے جو پانی کے چشمے کے بازو اگا ہے ہر وقت روحانی قوت و حیات کے سرمدی چشموں سے ہمیں تازگی پہنچتی رہتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خارجی زندگی باطنی زندگی کا عکس ہے۔ ہماری باطنی زندگی یا النفس جیسا ہو گا ویسا ہی عکس ہمارے خارجی حالات ہونگے۔ ویسا ہی ہمارا آفاق ہو گا۔ آفاق تابع النفس ہے، آفاق (ماحول) میں تغیر النفس کے تغیر کا تابع ہے۔

۱۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ (الرعد: ۱۱)

”بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا یا کسی قوم پر سے اپنی نعمت اٹھا نہیں لیتا۔ جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔“

۲۔ ﴿ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكْ مَغْيِرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ (الانفال: ۵۳) ”یہ (جو عذاب ان لوگوں کو دیا گیا تو) اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جو نعمت کسی قوم کو دیتا ہے تو پھر اس کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنے دل کی حالت نہیں بدلتی۔“

یعنی اعتقاد اور نیت جب تک نہ بدلے تو اللہ کی نعمت چھینی نہیں جاتی (موضع القرآن)

اللہ نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اپنی عطا کردہ نعمت سے بائیں صورت محروم کرتا ہے جب وہ اپنے عقائد و اعمال اور اخلاق کو بدل کر اپنے آپ کو اس نعمت کا قطعی غیر مستحق ثابت کر دیتی ہے۔ مثلاً ایمان کی جائے کفر، شکر کی جائے ناشکری، نیکی کی جائے گناہ کرنے لگتی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ بھی اس سے اپنی عطا کردہ نعمت واپس لے لیتا ہے۔ اور اسے مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

خارج کا تغیر، ماحول کا بدلنا، حالات پر قابو پانا ہو تو باطن کا تغیر، النفس کا بدلنا ضروری ہے۔ اگر باطن میں کبھی ہو، النفس خام و ناشائستہ ہو، تو خارج میں کبھی، ناہمواری عدم توافقی یا دوسرے الفاظ میں درد و غم، قلت و اقلال، ضیق و پریشانی کا ہونا ضروری ہے۔

باطن یا النفس سے مراد ظاہر ہے کہ نفس اور اس کی صفات ہیں اور ان سے پیدا ہونے والے افعال و اعمال ہیں۔ اب ماحول کی ناسازگاری، ضیق و پریشانی، رنج و غم، درد و الم راست نتیجہ ہے باطنی زندگی کا، یعنی رذائل اخلاق کا، اتباع ہوئی کا، خواہشات کی پیروی کا، جرم و معصیت کا، قرآن حکیم نے اس امر کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

﴿وما أصابكم من مصيبة فبما كسبت أيديكم ويعفوا عن كثير﴾ (الشوریٰ- ۳۰)  
ترجمہ: (لوگو!) تم پر جو مصیبت آتی ہے تو تمہارے ہاتھوں نے جو کیا اس کی سزا میں اور وہ (اللہ تعالیٰ) تمہارے بہت (سے قصور) معاف کر دیتا ہے۔

یعنی تمہارے اپنے برے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ اس کی رحیمی اور کریمی ہے۔ اگر وہ ہر قصور پر گرفت کرتا تو زمین پر کوئی جاندار باقی نہ رہتا۔

حدیث: حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بندے کو کوئی چھوٹی یا بڑی مصیبت نہیں پہنچتی مگر وہ اس کے گناہ کی بدولت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ جو اس سے درگزر فرماتا ہے وہ اس سے زیادہ ہوتا ہے۔“ پھر آپ ﷺ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔“ (شوکانی حوالہ ترمذی)  
اسی اصول کو کسی اور جگہ اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے:

﴿اولما أصابتكم مصيبة قد أصبتم مثلها قلتم 'أنى هذا؟' قل هو من عند أنفسكم ان الله على كل شئ قدير﴾ (آل عمران: ۱۶۵) یعنی: ”اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی کہ تم اس سے دو چند پہنچا چکے ہو تو کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آئی؟ آپؐ فرمادیں گے کہ یہ تکلیف تم کو تمہارے ہی طرف سے پہنچی۔“  
رسول اللہ ﷺ نے اس اصول کی تفسیر یوں فرمائی ہے (انما هي أعمالكم ترد عليكم) (حدیث)  
یہ تمہارے اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں صحیح مسلم کی روایت میں اور زیادہ وضاحت کیسا تھ فرمایا:  
”یہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے جن کو میں محفوظ رکھتا ہوں (تمہارے نامہ اعمال میں لکھواتا جاتا ہے کہ ان کا پورا پورا بدلہ تم کو ملے) اگر تم میں سے کوئی خیر پائے تو اللہ کا شکر کرے اور اگر اس کے خلاف پائے تو سوائے نفس کے کسی پر ملامت نہ کرے۔“

اس اصول کی وضاحت میں حضرات سلف نے جو مثال استعمال کی ہے وہ نہایت صحیح اور صاف ہے۔ وہ شخص اور اس کے سایہ سے اس اصول کو سمجھاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے۔ اگر کوئی شے ٹیڑھی ہو تو اس کا سایہ بھی ٹیڑھا ہو گا اور اگر سیدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہو گا۔ انفس شخص کی مانند ہے اور ماحول اس کا سایہ ہے یا صفات و اعمال شخص کی مثال ہے، حالات و واقعات ان کا عکس۔

جو اعمال ہم سے سرزد ہوتے ہیں ویسے ہی ہمارے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ذرا اپنے اعمال پر نظر رکھنا..... کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے کبھی و راستی ہر دو میں۔

اس صداقت پر امام شعرانی کو اتنا یقین تھا کہ اگر اپنے دوستوں یا بیوی یا نوکروں سے کجروی یا نشوونگہ گریز

اپنے معاملہ میں پاتے تو ذمہ دار اپنی ذات کو ٹھہراتے اور اپنے ہی پر ملامت کرتے ان کا یہ مشہور قول ہے :

یعنی : ”لوگ میرے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتے ہیں جیسا کہ میں ان کے ساتھ کرتا ہوں۔ پس ملامت میری ہی ذات پر ہے نہ کہ ان کی ذات پر، کیونکہ ان کی مثال کسی شیئی کے سایہ کے مانند ہے۔ اگر شے سیدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہے اور اگر شے ٹیڑھی ہے تو سایہ بھی ٹیڑھا۔ جس شخص نے اس بات کی توقع کی کہ ٹیڑھی شے کا سایہ سیدھا ہوگا تو اس نے محال کی تمنا کی قرآن عظیم نے ﴿کل نفس بما کسبت رھیة﴾ (الدرث: ۳۸) یعنی : ”ہر شخص اپنے (برے) کاموں کے بدل گرفتار رہے گا“ اور ﴿کل امرئ بما کسب رھین﴾ (طور: ۲۱) یعنی : ”جس طرح گروی رکھی ہوئی چیز پیسہ دیئے بغیر نہیں چھوٹ سکتی، اسی طرح ہر آدمی اپنے عمل کا

ثواب یا عذاب پائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور ﴿لھا ما کسبت و علیھا ما کسبت﴾ (البقرة: ۲۸۶)

یعنی : ”اور جو اس نے اچھا کام کیا اسی کو فائدہ ہوگا، اور جو بر کام کیا اس کا وبال اسی پر پڑے گا“ اور ﴿من عمل صالحاً فلنفسه ومن اساء فعلیھا﴾ (حم السجدة: ۴۶) یعنی ”جو کوئی اچھا عمل کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے اور جو کوئی بر کرے گا وہ اپنے ہی برے کے لیے (اسی پر وبال پڑیگا)۔“

فلسفہ اخلاق کی زبان میں اس کو یوں بیان کرتے ہیں : ”الناس مجزیون بأعمالهم ان خیراً فخییر وان شرراً فشر“۔ یعنی : ”لوگوں کو اعمال کی جزا ملتی ہے اگر اعمال اچھے ہوں تو ان کی جزا بھی اچھی ہوتی ہے اور اگر اعمال بد ہوں تو ویسی ہی ان کی جزا ہوتی ہے۔“

خوب سمجھ لو کہ زمین و آسمان کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور قرآن کریم نے (سورة الجاثیة: ۲۲) میں صاف الفاظ میں اس کی وضاحت کر دی ہے : ﴿خلق السموات والأرض بالحق لتجزیٰ کل نفس بما کسبت وهم لا یظلمون﴾ یعنی : ”حق تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا کہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ذرا ظلم نہ کیا جائے۔“

یاد رکھو کہ زندگی کا مقصد طفل شیر خوار کی طرح ہماری دایہ گری کرنا نہیں۔ یہ فرائض و واجبات کا بار ہمارے کندھوں پر رکھتی ہے، تاکہ ان کی ادائیگی میں ہم زیادہ سے زیادہ قوی ہوتے جائیں ہمارے اخلاقی اعصاب و عضلات طاقتور ہوں اور ہم انسان کامل بن جائیں اور اس سرور مستی سے سیرہ یاب ہوں جو کالمین کیلئے مقدر کی گئی ہے۔ یاپوں کو کہ ہماری زندگی ایک تربیت گاہ ہے، حق تعالیٰ ہمارے معلم و استاذ ہیں، روزمرہ کے واقعات اور حادثات و آلات ہیں جن کے ذریعہ ہماری سیرت کی تکمیل کی جا رہی ہے۔ دنیا کی مثال ایک روح ساز وادی سے

دی جاتی ہے۔ یہاں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت کے خفتہ نغمے بیدار کیے جاتے ہیں، راحت و غم، بلا و طرب، لذت و الم ہمیں اپنا سلوک لینے میں مدد دے رہے ہیں۔ دونوں ہمارے لئے خیر ہیں، ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔

موت و حیات کی تخلیق قرآن حکیم کے الفاظ میں اس لیے ہوئی ہے کہ اس امر کی آزمائش کی جائے کہ ہم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے: ﴿الذی خلق الموت والحیوة لیبلوکم أیکم أحسن عملاً﴾ (سورۃ الملک: ۲) یعنی: ”جس نے موت اور زندگی (دونوں) کو اس لئے پیدا کیا کہ تم کو آزما کر دیکھے کہ کون تم میں اچھے کام کرتا ہے اور کون برے۔“

جب حقیقت یہ ہے تو مرد و مومن نہ زندگی کے تغیرات سے گھبراتا ہے نہ ان سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، یہ تو اس کی تادیب و تزکیہ کے لیے ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ان تغیرات و تحولات سے وہ اسی طرح سبق لیتا ہے جس طرح ایک ذہین و محنتی طالب علم استاذ کی تقریر و تعلیم سے استفادہ کرتا ہے۔ اپنے جمل کو دور کرتا ہے، اپنے نفس کا تزکیہ، قلب کا تصفیہ اور اپنے دماغ کا خیالات فاسدہ سے تخلیہ کرتا ہے۔ ان واقعات و تغیرات کی حیثیت اس کی نگاہ میں ایک پردہ کی سی ہے اور اس پردہ کے پیچھے وہ حق تعالیٰ ہی کو مصروف عمل دیکھتا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کہا کرتے:

”اے پروردگار! مجھے ہر شے میں اپنی فاعلیت کا مشاہدہ نصیب کر تاکہ تیرے سوا کسی کو فاعل نہ دیکھوں..... تاکہ تیرے اقدار کے جاری ہونے سے مطمئن ہو جاؤں اور تیرے حکم کا مطیع و فرمانبردار بن جاؤں“

جاہل تغیرات کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے کبیدہ خاطر ہوتا ہے..... ان کا مقابلہ کرتا ہے..... مزاحم ہوتا ہے! لیکن زندگی دائمی تغیر کا نام ہے۔ - ”سکون محال ہے قدرت کے کارخانہ میں۔“

﴿لقد خلقنا الانسان فی کبد﴾ (سورۃ البلد: ۴)

”بے شک ہم نے آدمی کو (ایسا) بنایا ہے (کہ سدا رنج اور) مصیبت میں (رہے)۔“

جاہل کا مقابلہ خود زندگی قانون اور اس کی قوتوں سے ہے یہ قانون اور اس کی قوتیں مقصد و غایت کے لحاظ سے منصفانہ اور مہربان اور عمل کے لحاظ سے غیر جانبدارانہ اور ناقابل شکست ہوتی ہیں۔

ہمیں زندگی کے واقعات و تغیرات کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے ساتھ برضا و رغبت اشتراک عمل کرنا چاہیے! یعنی..... ہمیں اس سبق پر نگاہ رکھنی چاہیے جو ہمیں ان واقعات و تجربات کے ذریعہ دیا جا رہا ہے کیونکہ جب ہم اس سبق کو یاد رکھتے ہیں اور اس کے مطابق اپنی سیرت و عمل میں تغیر پیدا کر لیتے ہیں تو پھر یہ

تکلیف دہ، ناخوشگوار اور الناک واقعات و تجربات رفع ہو جاتے ہیں اور طمانیت و برد قلمی ہمیں نصیب ہوتی ہے، حقیقی معنی میں کامیاب زندگی کا راز حق تعالیٰ کے ارادے اور مقصد کے ساتھ توافقی و اتحاد میں ہے اور اس مقصد و ارادہ کا اظہار ان ہی واقعات و تجربات و تغیرات میں ہو رہا ہے جس کے ساتھ توافقی ضروری ہے جس کا شرع کی زبان میں ”توافق بالقضاء“ نام ہے، جس کو ”رضا بالعطاء“ و ”حفظ حال“ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

تمام تجربات کا مقصد ہمیں اس راہ پر لے چلانا ہے جو رب کائنات کی طرف لے جاتا ہے، ہم اپنے جہل کی وجہ سے اس راہ سے بھٹک جاتے ہیں اور دور جا پڑتے ہیں۔ جذبات و شہوات ہمیں صراطِ مستقیم سے ہٹا لے جاتے ہیں، صراطِ مستقیم کی طرف ہمارے قدم اسی وقت اٹھ سکتے ہیں جب ہماری سیرت کی تکمیل ہو اور ہمارا روحانی ارتقاء عمل میں آئے..... اب زندگی میں رونما ہونے والے سارے تجربات و واقعات ہماری سیرت کی تکمیل کرتے ہیں اور ہمارے روحانی ارتقاء میں مدد دیتے ہیں تاکہ ہم اس صراطِ مستقیم پر چلیں جو حق تعالیٰ کی طرف ہمیں لے جاتی ہے لہذا تجربات خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار، مسرت بخش ہوں یا غمناک، یہ ہمارے خیر برتر کے حصول کے لیے ضروری و لادبی ہیں، ان میں ہمارے لئے ہدایت کا ایک سبق پوشیدہ ہوتا ہے۔ جس کو معلوم کرنے اور جس پر عمل پیرا ہونے کی ہمیں کوشش کرنی چاہیے اور جو نئی ہم نے اس ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا، ہمیں شقاوت و گمراہی سے نجات مل جاتی ہے اور ان سے پیدا ہونے والے برے نتائج اور خوف و حزن سے بھی!

﴿فَمَنْ اتَّبَعَ هِدَايَ فَلَا يَضِلْ وَلَا يَشْقَىٰ ۝ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ﴾ (سورۃ طہ: ۱۲۳-۱۲۴)

یعنی: ”پھر اگر میری طرف سے تم پر ہدایت آئے (میرا پیغمبر آئے یا میرا کلام) تو جو کوئی میری ہدایت پر چلے نہ وہ (دنیا میں) بہت گناہ اور نہ (آخرت میں) بد نصیب ہوگا۔“

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کے مبارک طریقہ کے مطابق زندگی گزارنا دنیا و آخرت دونوں کو نالینا ہے۔

زندگی کا ہر تجربہ، ہر واقعہ ہمیں خیر لائقانہی کی طرف لیجاتا ہے، تصادم کی جائے اس سے توافقی ہی سب سے بڑی عقلمندی ہے ”رضابالقصاء“ اسی کو کہتے ہیں۔ ہماری زندگی میں کوئی حادثہ نہیں نازل ہوتا مگر وہی جو حق تعالیٰ نے ہمارے لیے مقدر فرمایا ہے، وہ ہمارے مولیٰ ہیں، آقا ہیں، ہمیں اپنے سب کام انہی کے سپرد کر دینے چاہئیں۔

﴿قُلْ لَن يَصِيبِنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾ (التوبہ: ۵۱) یعنی: ”اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو ہم کو کوئی مصیبت پیش نہیں آسکتی مگر جو اللہ تعالیٰ نے

ہماری قسمت میں لکھ دی ہے، وہی ہمارا مالک ہے اور مسلمانوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“

تمام تجربات و حادثات دواء و معالجہ کی غرض سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جب ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو وہ غائب ہو جاتے ہیں، پھر ان دردناک حادثات کی تکرار عموماً نہیں ہوتی پھر راحت و طمانیت ہی میں زندگی گزرتی ہے۔

جب تک ہم حادثاتِ زمانہ سے سبق نہیں لیتے کجروی و گمراہی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اتباعِ شہوات میں گرفتار رہتے ہیں اور ان مصائب و آفات کو خود پیدا کرتے رہتے ہیں جن سے ہم نجات پانا چاہتے ہیں۔ جب ہم نے سبق ہدایت حاصل کیا، ہماری سیرت بدلتی ہے۔ ہم میں تقویٰ کے صفات پیدا ہوتے ہیں اور ہمارا نظریہ نگاہ بدلتا ہے۔ قانونِ الہی کے مطابق ہم فکر کرنے لگتے ہیں، حق تعالیٰ سے ربط قائم کرنے لگتے ہیں، ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے لگتے ہیں۔ آفات و مصائب کا ورود جس غرض کی تکمیل کے لیے ہو رہا تھا اب وہ غرض چونکہ پوری ہو چکی ہوتی ہے وہ بھی ہمدردِ غائب ہونے لگتے ہیں۔

دردناک تجربات و حادثات ہی سے ہمیں سبق ہدایت حاصل کرنا کافی نہیں بلکہ ان تجربات و حالات سے بھی جو خوشگوار اور راحت بخش ہوتے ہیں ہمیں سبق سیکھنا ضروری ہے۔ آسائش و نعمت کی حالت میں بھی ہمیں شکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کی یاد میں مستقل مشغول رہنا چاہیے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں تاکید کے ساتھ حکم دیا ہے (فلیکثر الدعاء عند الرخاء) ترجمہ: ”آرام و آسائش کے وقت زیادہ دعا کرتے رہو۔“

سکون و چین کی حالت میں دعا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر نعمت کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھا جائے۔ ارشادِ ربانی ہے ﴿وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ﴾ (النحل: ۵۳) ترجمہ: ”جتنی نعمتیں تمہارے پاس ہیں وہ بھی سب اللہ کی دی ہوئی ہیں۔“

درحقیقت متمتع و قاسمِ نعمت حق تعالیٰ ہی ہیں، لہذا ان ہی کی مرضی کے مطابق نعمتوں کا استعمال ضروری ہے۔ جب ہمیں نعمتیں عطا کی جاتی ہیں، جب ہم عافیت کی حالت میں ہوتے ہیں، جب ہمیں صحت و تندرستی ملتی ہے، امراض و آلام سے محفوظ ہوتے ہیں، فراخی و آسائش سے متمتع ہوتے ہیں تو یہ سب ہماری آزمائش و ابتلاء کے لیے ہوتا ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ اس عافیت کے نتیجے کے طور پر ہم میں کبر و عجب تو نہیں پیدا ہو گیا۔ ہم شہوتوں اور لذتوں کے درپے تو نہیں ہو گئے، موجودہ نعمتوں کو حقیر و ذلیل تو نہیں سمجھنے لگے اور ان نعمتوں میں عیب و نقصان تو نہیں نکالنے لگے؟ دیکھا جاتا ہے کہ کیا نعمتوں اور راحتوں کی وجہ سے ہم حق تعالیٰ کی اطاعت سے روگرداں ہو کر گناہوں اور معصیتوں میں منہمک تو نہیں ہو گئے۔ اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ نعمت کی آزمائش مصیبت کی آزمائش سے زیادہ سخت ہوتی ہے، خوشی کا فتنہ تکلیف کے فتنہ سے بہت بڑا ہوتا ہے!